ISSN: 2959-2224 (Online) and 2959-2216 (Print)
Open Access: https://journals.iub.edu.pk/index.php/uas/index
Publisher by: Department of Hadith, The Islamia University of Bahawalpur, Pakistan.

اقبال کی شاعری میں روحانی اخلاقیات کا تصور: ایک مابعد الطبیعاتی مطالعہ

The Concept of Spiritual Ethics in Iqbal's Poetry: A Metaphysical Study

Altaf Hussain*
M.Phil Scholar, Dept. of Urdu, Superior University Faisal Abad
Email: ah748216@gmail.com

Dr. Mubshar Saeed Bajwa
Assistant Professor, Dept. of Urdu, Superior University Faisal Abad

Abstract
This article explores the central role of *Tawheed* (the concept of monotheism) in shaping the philosophical and poetic vision of Allama Muhammad Iqbal. For Iqbal, *Tawheed* is not merely a theological doctrine but a dynamic and revolutionary force that breathes vitality into the individual and the collective Muslim identity. The paper traces the roots of Iqbal's concept of *Tawheed* in his spiritual upbringing and Qur'anic reflection, distancing it from speculative theology and pantheistic mysticism. It examines how *Tawheed* informs his notions of *Khudi* (selfhood), spiritual freedom, political unity, and intellectual awakening. The study reveals that Iqbal's poetry is a poetic manifesto of *Tawheed*, invoking moral empowerment, cultural resistance, and existential purpose. Furthermore, the article assesses the impact of *Tawheed* on Iqbal's aesthetics, historical vision, and his critique of both materialism and passive mysticism. By embedding *Tawheed* into the heart of his poetic and philosophical discourse, Iqbal offers a holistic worldview where belief, action, creativity, and human dignity converge under the banner of divine unity.

Keywords: Allama Iqbal, Concept of Ethics, Philosophy of Khudi, Mard-e-Momin, Islamic Values, Justice and Benevolence, Knowledge and Action, Perfect Human, Social Reform, Monotheism, Spiritual Development, Movement and Awakening, Character Building, Universal Morality, Ethics in Poetry

جوہرِ انسانیت در حقیقت اوصافِ حمیدہ کے اس قیمتی خزانے کا نام ہے جو لمحہ بہ لمحہ انسان کے وجود کو وقعت اور اعتبار بخشتا ہے۔ انہی محاسن کی تابندہ کہکشاں میں ایک ایسا روشن ستارہ کردار کی بلندی ہے، جسے ہم 'اخلاق' کے نام سے جانتے ہیں۔ اخلاق محض ایک فرد کا ذاتی وصف نہیں، بلکہ یہ وہ محور ہے جس کے گرد پوری انسانیت کی بقا اور عظمت کا سفر گردش کرتا ہے۔ یہ وہ آفاقی سچائی ہے جو رنگ، نسل، مذہب اور جغرافیائی حدود سے ماورا، ہر انسانی تہذیب کی مشترکہ میراث اور متفقہ باب ہے۔

کسی بھی قوم کی زندگی کا انحصار مادی وسائل پر نہیں، بلکہ اس کی اخلاقی بنیادوں کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ اخلاقی شعور ہی وہ آبِ حیات ہے جو معاشرتی زندگی کے گلشن کو ایثار، بھائی چارے، رواداری اور عدل و احسان جیسے پھولوں سے مہکاتا ہے۔ جب تک یہ احساس

* Email of corresponding author: ah748216@gmail.com

زندہ رہتا ہے، معاشرہ ایک متحرک اور ذمہ دار اکائی کی صورت میں پروان چڑھتا ہے۔ لیکن جہاں یہ حس دم توڑ دیتی ہے، وہاں تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور پورا سماج زوال اور بربریت کی تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ درحقیقت، اخلاق ہی وہ حدِ فاصل ہے جو انسان کو حیوانی جبلتوں سے ممتاز کرتی ہے۔ جس قوم کا دامن اخلاقی اقدار سے خالی ہو، وہ مہذب کہلانے کا حق کھو دیتی ہے اور وہاں امن و سکون کے بجائے خوف اور انتشار کا راج ہوتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اخلاقی اقدار خود بہ خود زندہ نہیں ہوتیں، بلکہ جب کوئی قوم خوابِ غفلت کا شکار ہوتی ہے تو اس کی بیداری کے لیے ایک "پیکرِ عمل" یا "مردِ کامل" کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ وہ نقیبِ انقلاب ہوتے ہیں جو اپنے کردار، گفتار اور افکار سے مردہ روحوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ انہی تاریخ ساز شخصیات کی صف میں برصغیر کے فکری افق پر ایک ایسا ہی خورشیدِ فکر و نظر طلوع ہوا، جسے دنیا شاعرِ مشرق، حکیم الامت علامہ محمد اقبال کے نام سے جانتی ہے۔ اقبال نے اپنی پوری زندگی اسی عظیم پیغام کی آبیاری میں صرف کر دی اور اخلاق کے چراغ سے فکر و عمل کی دنیا کو روشن کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

اقبال کا فلسفہ، اخلاقیات کے اُس خوش رنگ زیور سے آراستہ ہے جو انسانیت کو حقیقی معراج عطا کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے افکار کو معاشرتی اصلاح اور تعمیرِ نو کا ذریعہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ نگاہِ دور بیں اور فکرِ رسا عطا کی تھی جس سے وہ معاشرے کے ہر ناسور کو بخوبی پہچانتے تھے۔ مادیت کی چکاچوند، نفس پرستی کا گرداب، خود غرضی کا زہر اور روحانی اقدار کا انحطاط جیسے مہلک امراض پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہیں سب سے بڑھ کر اپنی قوم، بالخصوص نئی نسل کی فکری آوارگی اور روحانی بے چینی کا قلبی اضطراب تھا کہ کہیں یہ سیلاب اس کی تہذیبی شناخت کو بہا کر نہ لے جائے۔ اسی کرب اور احساسِ ذمہ داری نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے تصورِ اخلاق کی عمارت دین کی محکم اساس پر قائم کریں اور ایسی آفاقی انسانی اقدار کی ترویج کے لیے کوشاں ہوں جو ہر دور میں انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔

لفظ "اخلاق" کے صدف کو اگر گہرائی سے دیکھیں تو اس کے اندر "خُلق" کا موتی چمکتا نظر آتا ہے، جس کا مفہوم محض ظاہری عادات و اطوار تک محدود نہیں۔ یہ باطن کی صورت گری، یعنی سیرت کی تعمیر کا نام ہے۔ اس ایک جامع لفظ میں تہذیبِ نفس، انسانی مروت، معاشرتی حکمت (سیاستِ ملکی)، اور کردار کی فضیلت جیسے ان گنت رنگ سمائے ہوئے ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانیت کی پوری عمارت قائم ہے۔

علامہ اقبال کے لیے شاعری محض فن برائے فن نہیں، بلکہ تعمیرِ سیرت اور بیداریِ ملت کا ایک مقدس وسیلہ تھی۔ انہوں نے اپنے شعور انگیز کلام کے ذریعے اخلاق کے انہی آفاقی اصولوں کو عوام کے دل و دماغ میں زندہ کرنے کی لازوال کوشش کی۔ حکیم الامت محض ایک نظریاتی فلسفی نہ تھے، بلکہ ان کی اپنی حیاتِ طیبہ ان کے افکار کا عملی نمونہ اور اخلاقِ حسنہ کا ایک مجسم پیکر تھی۔ ان کی زندگی کا ہر ورق بلند کردار، خودداری اور عظمتِ انسانی کے تصورات سے مزین ہے۔

جب ہم فکرِ اقبال کے بحرِ ذخار میں غوطہ زن ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تہوں میں اخلاقِ کریمانہ کا ایک مربوط اور متحرک تصور موجزن ہے۔ ان کے ہاں "مردِ مومن" کا کردار اوصافِ حمیدہ، اعمالِ صالحہ، اور احوالِ عالیہ کا ایک حسین مرقع ہے۔ یہ کردار اقبال کے فلسفۂ خودی کا عملی ظہور ہے، جہاں خود شناسی، خود اعتمادی، اور خود احتسابی ہی دراصل معرفتِ ذات کا دوسرا نام ہیں۔ اقبال

نے اپنی شاعری میں انہی انقلابی تصورات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان کے پیغام میں بیداریِ شعور، رفق و رحمت، عدلِ اجتماعی، والدین کا اکرام، سادگی، غیرت و حمیت، پاکیزگیِ کردار، اور احترامِ آدمیت جیسے موضوعات چراغ بن کر فکر کی راہوں کو روشن کرتے ہیں۔ بقول نصرت رشید:

"اقبال کی نظر میں اخلاقیات کا تعلق انسانی اعمال سے ہے اور اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ نیتوں سے مراد انسان کے ارادے کی پختگی ہے۔ اور انہی نیتوں کو پختہ بنانے کے لیے انسان کو یہ قوانین اپنا کر اس کا پابند ہونا چاہیے اقبال کے نظموں کے حوالے سے اخلاقیات انسانی زندگی میں بنیادی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اخلاق کی قانونی حیثیت ہوتی ہے۔ جس کی بنیادیں انسانی نفسیات ارادہ آرزو، اخلاق بطور قانون گفتار، کردار جیسے عناصر ہی ایک انسان کو مرد مومن بناتا ہے۔"(1)

علامہ اقبال کے ہاں اخلاقیات کا تصور یک رخا نہیں، بلکہ اس میں جلال و جمال کا ایک حیرت انگیز توازن پایا جاتا ہے۔ انہوں نے جہاں حق و باطل کی معرکہ آرائی میں فولادی عزم، شجاعت اور جرأت کو لازم قرار دیا، وہیں احباب کی محفل میں بریشم کی سی نرمی، ہمدردی اور اخوت کو بھی کردار کی معراج سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مردِ مومن بیک وقت قہاری و غفاری، اور قدوسی و جبروت جیسی صفات کا حامل ہے۔ یہ تضاد نہیں، بلکہ شخصیت کی تکمیل ہے۔ وہ انسان کو محض 'مشتے از خاک' نہیں سمجھتے، بلکہ اسے کائنات کی وہ عظیم مخلوق گردانتے ہیں جس کی رفعتوں کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا ذکر ملائکہ کی محفلوں میں بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے جب انسان اپنے کردار سے مومن ہونے کا ثبوت دیتا ہے تو کائنات کی وسعتیں اس کے لیے مسخر ہو جاتی ہیں۔ اس جامع تصور کی ترجمانی اقبال کے یہ اشعار کس خوبصورتی سے کرتے ہیں:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن (2)

فکرِ اقبال میں اخلاقیات کا سب سے متحرک اور انقلابی پہلو "حرکت و عمل" کا فلسفہ ہے۔ ان کے نزدیک جمود، چاہے وہ فکری ہو یا عملی، موت کے مترادف ہے۔ ایک جامد، بے حس اور لاتعلق انسان کمزور خودی کا مالک ہوتا ہے، جو معاشرے میں بگاڑ اور انتشار کا سبب بنتا ہے۔ اس کے برعکس، حرکت، جدوجہد اور عمل ہی انسان کو حقیقی بلندی اور مرتبے سے ہمکنار کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نظر میں، اپنے بازوؤں کی محنت سے رزق کمانے والا مزدور، اُس ظالم جاگیر دار سے ہزار گنا بلند ہے جو کسانوں کا خون چوس کر اپنی تجوریاں بھرتا ہے اور دھرتی کو بانجھ کر دیتا ہے۔ اول الذکر کا عمل تعمیر ہے اور ثانی الذکر کا وجود تخریب۔ پہلا زندگی کی علامت ہے اور دوسرا موت کا پیامبر۔

جب انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کے خزانے پر قفل ڈال دے، جرأت و اقدام کے میدان میں قدم رکھنے سے ہچکچائے اور زندگی کی تیز رفتار نبض سے اپنا رشتہ توڑ لے، تو اس کی روح پتھر کی طرح سخت اور بے حس ہو جاتی ہے۔ وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ

جاتا ہے، جو محض ایک بے جان مادے کا ڈھیر ہے۔ انسانی روح کا سفر تو دراصل اسی شعور اور آگہی کا نام ہے کہ وہ اپنے باطن اور ظاہر کے درمیان ایک پُل تعمیر کرے اور کائنات کے ہر مظہر سے ایک زندہ اور تخلیقی تعلق استوار کرے۔ یہ گہرا ربط ایک صاحب اخلاق انسان ہی قائم کر سکتا ہے، اور اس کی کلید علم کی روشنی ہے۔

علم وہ نور ہے جو نہ صرف جہالت کی تاریکیاں مٹاتا ہے بلکہ اخلاقِ عالیہ کے دروازے بھی کھولتا ہے۔ جب انسان علم کے چراغ سے اپنے باطن کو منور کرتا ہے تو اسے کردار کی بلندیوں تک پہنچنے کا راستہ خود بخود مل جاتا ہے۔ اسی لیے اقبال کے نزدیک، علم اخلاقی تعمیر کی پہلی سیڑھی ہے۔ وہ نوجوان نسل کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں اپنے اندر چھپی ہوئی بے پناہ قوتوں کا احساس دلاتے ہیں:

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر ، اثرِ آہِ رسا دیکھ! (3)

لیکن اقبال کے ہاں علم کا تصور محض کتابی معلومات یا ذہنی عیاشی تک محدود نہیں۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اگر علم، عمل اور اخلاص کی روح سے خالی ہو تو وہ کردار کی تعمیر کے بجائے تخریب کا باعث بن جاتا ہے۔ ایسا علم رکھنے والا عالم، اُس جاہل سے بھی بدتر ہے جو اپنی جہالت کا معترف ہو۔ جاہل تو حیوانوں کی طرح محض جبلتوں کی تسکین میں جیتا ہے، جسے نہ گفتار کا سلیقہ ہوتا ہے، نہ رفتار میں وقار، اور نہ ہی کردار میں کوئی گہرائی۔ یہ تینوں عناصر (گفتار، رفتار، کردار) ہی انسانی زندگی کی سمت اور معیار کا تعین کرتے ہیں۔

اس کے برعکس، وہ علم جو عمل کے سانچے میں نہ ڈھلے، ایک آزاد اور باشعور انسان (احرار) کے لیے زہرِ ہلاہل سے کم نہیں۔ یہ ایک ایسا بوجھ ہے جس کا حاصل دو مٹھی جو کے برابر بھی نہیں۔ اقبال اس تباہ کن علم سے خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وہ علم نہیں ، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے دو کفِ جو (4)

ان اشعار سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ کردار سازی کے لیے صرف علم کافی نہیں۔ جب تک علم کے ساتھ عمل کی طاقت اور اخلاص کی پاکیزگی شامل نہ ہو، وہ بے ثمر رہتا ہے۔ ایک عالم بھی اخلاق سے عاری ہو سکتا ہے، اور وہ علم جو انسان کے اندر تکبر پیدا کرے اور اسے مقصدِ حیات سے غافل کر دے، اس کے لیے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ ایسا شخص ایک زندہ لاش کی مانند ہے جو اپنے وجود کے حقیقی جوہر سے ناآشنا ہے۔ لہٰذا، حقیقی اخلاقی تعمیر کے لیے لازم ہے کہ انسان علم کے نور کو عمل کی روشنی سے ہمکنار کرے اور تکبر کو اپنے دل سے کھرچ کر پھینک دے۔

ہر فرد کا اندازِ گفتگو اس کے باطن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی کا لہجہ پتھر کی طرح سخت اور کھردرا ہوتا ہے تو کسی کی زبان سے شکر کے سے الفاظ جھڑتے ہیں۔ درحقیقت، انسان کی اصل پہچان اس کے طرزِ کلام سے ہی ہوتی ہے، کیونکہ الفاظ وہ بیج ہیں جو دل کی زمین

سے اگتے ہیں۔ سخت اور درشت لہجہ باطن کے بنجر پن اور اخلاقی قحط سالی کی علامت ہے۔ اس کے برعکس، نرم اور شائستہ گفتگو دل کی زرخیزی اور کردار کی بلندی کا ثبوت دیتی ہے۔ کلام کی نرمی اور لہجے کی حلاوت محض ظاہری خوش اخلاقی نہیں، بلکہ یہ قلب کی پاکیزگی اور روح کی لطافت کا مظہر ہے۔

اس کی بہترین مثال یہ زمین ہے جس پر ہم بستے ہیں۔ خالقِ کائنات نے اس کی سطح کو نرم اور ملائم بنایا تاکہ یہ اپنے سینے سے زندگی کی ان گنت نعمتیں اگل سکے۔ اسی نرمی کی بدولت یہ مخلوق کی غذائی ضروریات پوری کرتی ہے اور اسی کے بطن سے سونا، چاندی، ہیرے اور موتی جیسے گراں قدر خزانے برآمد ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح، جو انسان نرم خو اور شائستہ مزاج ہوتا ہے، قدرت اس کے اندر بھی بے شمار تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کر دیتی ہے اور ایسا شخص معاشرے میں ہر دلعزیز بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص درشت مزاجی اور سخت کلامی جیسے عیوب میں مبتلا ہو، وہ نہ صرف سماجی قدر و منزلت سے محروم رہتا ہے بلکہ اپنی ہی شخصیت کے امکانات کو ضائع کر دیتا ہے۔ اقبال نے اسی نقطے کو اپنے فلسفے میں مرکزی حیثیت دی ہے۔ ان کے نزدیک مردِ مومن کی شخصیت متضاد صفات کا حسین امتزاج ہوتی ہے:

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاک باز (5)

وہ اپنی قوم کو مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر امید کی روشنی دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارا باطن بھی اس دھرتی کی طرح ہے، جسے اگر فکر و عمل کے پانی سے سیراب کیا جائے تو یہ حیرت انگیز نتائج پیدا کر سکتا ہے:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی (6)

تاہم، اقبال اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ ہر دل اس نرمی کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "بالِ جبریل" کے آغاز میں قدیم ہندوستانی شاعر بھرتری ہری کا یہ قول نقل کر کے اس نکتے کو مزید واضح کیا ہے کہ جس طرح پھول کی نازک پتی ہیرے جیسے سخت پتھر کو کاٹ سکتی ہے، اسی طرح نرم اور شائستہ کلام بھی ایک جاہل اور نادان شخص پر اثر انداز ہونے سے قاصر رہتا ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر (7)

اقبال کے نزدیک اخلاق محض ایک شخصی خوبی نہیں، بلکہ یہ وہ بنیادی اور اساسی علم ہے جس پر پوری شخصیت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ انہوں نے اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کیا، جس کی بنیاد حریت، مساوات، صداقت، اخوت، اور رواداری جیسی آفاقی اقدار پر قائم ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ کوئی بھی تہذیب اگر اخلاقی بنیادوں سے محروم ہو، تو وہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے اندر خودکشی کے جراثیم پرورش پانے لگتے ہیں۔ اپنی بصیرتِ کاملہ سے انہوں نے مغربی تہذیب کے مادی

عروج کے پیچھے چھپی روحانی کھوکھلے پن اور اخلاقی بحران کو بھانپ لیا تھا اور یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ تہذیب اپنے ہی بنائے ہوئے ہتھیاروں سے خود کو تباہ کر لے گی:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، ناپائیدار ہو گا [8]

اقبال کا فکری کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کا کلام محض اخلاقی نصیحتوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ اس میں انسانی نفسیات کی گتھیاں سلجھانے، فلسفہ و حکمت کے موتی رولنے اور "انسانِ کامل " کے تصور کو اجاگر کرنے کی ایک مسلسل تڑپ دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک ایسے کامل انسان کا خاکہ پیش کیا جو صرف اپنی ذات کے لیے نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی فلاح کے لیے جیتا ہے اور یہی ان کے تصورِ اخلاق کا نچوڑ ہے۔ بقول ڈاکٹر صنم شاکر:

> "ایک عظیم اسلامی مفکر کی حیثیت سے اقبال نے وحدت اسلامی کو اپنے افکار کا محور بنایا۔ افکار اقبال کے غائر مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے توحید پر کامل ایمان کو وحدت اسلامی کا موثر ترین وسیلہ قرار دیا جس کا مقصد انسانیت کی فلاح ہے۔ اور اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات تسلیم کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ دل و نگاہ میں تسلیم کا جذبہ پیدا کیا جائے تا کہ ایسی سوچ پروان چڑھ سکے جو قومی یکجہتی کی راہ ہموار کرے اور انسان کو ترقی کی جانب مائل کیا جائے۔"[9]

علامہ اقبال نے اپنے فکری اور تخلیقی شعور سے ایک ایسے جامع نظامِ حیات کو جنم دیا جس کی جڑیں انسانی فطرت کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ یہ فکر جہاں پوری انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے، وہیں ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ایک مؤثر اور دل نشین منشور کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کے اس بحرِ حکمت سے ایسے ان گنت گوہر نایاب بر آمد ہوئے جنہوں نے ہر دور اور ہر قوم کے باشعور افراد کو متاثر کیا اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی فکر و عمل کی راہیں روشن کرتے رہیں گے۔

اقبال کے کلام میں جابجا ایسے بصیرت افروز اشارے ملتے ہیں جو ہمیں کائنات کے ایک بنیادی اصول سے روشناس کراتے ہیں یعنی " آئینِ قدرت اور اسلوبِ فطرت "۔ یہ اصول اس کے سوا کچھ نہیں کہ زندگی کا جوہر سکون میں نہیں، بلکہ مسلسل حرکت، جدوجہد اور ارتقا میں پوشیدہ ہے۔ جو شخص یا قوم اس راہِ عمل پر گامزن ہو جاتی ہے، وہی فطرت کی محبوب ٹھہرتی ہے:

یہی آئینِ قدرت ہے ، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن ، محبوبِ فطرت ہے [10]

اس فلسفے کی بہترین تمثیل اقبال نے اپنی نظم "اغوائے آدم" میں پیش کی ہے، جہاں وہ آدمؑ اور ابلیس کے درمیان اس مکالمے کو شعری جامہ پہناتے ہیں جو جنت سے زمین کی طرف ہجرت کے وقت وقوع پذیر ہوا۔ ابلیس، آدمؑ کو جنت کی بے مقصد اور جامد زندگی کے مقابلے میں دنیا کی پُرکشش اور متحرک زندگی کی طرف راغب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنت کا ابدی سکون دراصل ایک طرح کی روحانی موت ہے، جبکہ دنیا، جو دکھ سکھ اور محنت و مشقت کی ایک امتحان گاہ ہے، زندگی کا اصل جوہر ہے۔ یہاں کی جدوجہد

سے حاصل ہونے والے پھل کا ذائقہ ہی نرالا ہے۔ جب انسان اس دنیائے عمل میں قدم رکھتا ہے تو اس پر خود شناسی اور خدا شناسی کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ اپنی محنت اور کاوش سے عظمت و رفعت کے وہ مدارج طے کرتا ہے جو جنت کے سکون میں ممکن نہ تھے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں اقبال انسان کو اس کی حقیقی قدر و قیمت کا احساس دلاتے ہیں:

نہ تو زمیں کے لیے ہے ، نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے ترے لیے ، تو نہیں جہاں کے لیے (11)

ان کے نزدیک، زندگی ایک مسلسل کشمکش اور جہدِ مسلسل کا نام ہے، اور اس سفر میں اخلاقِ حمیدہ وہ زادِ راہ ہیں جن کے بغیر منزل تک پہنچنا ناممکن ہے۔ "حکمت "وہ سیڑھی ہے جسے قرآن نے "خیرِ کثیر" قرار دیا ہے۔ جو شخص اس نعمت کی قدر کرتا ہے، اس کی زندگی میں نہ صرف اخلاقیات کا نور پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ ان گنت باطنی خوبیوں سے بھی مالا مال ہو جاتا ہے۔

خالقِ کائنات نے انسان کے باطن میں صلاحیتوں کا ایک بے کنار سمندر چھپا رکھا ہے۔ جب انسان تدبر و تفکر سے کام لے کر ان پوشیدہ خزانوں کو دریافت کرتا ہے تو اس کے اندر نہ صرف انسانیت کا جوہر بیدار ہوتا ہے بلکہ اسے اپنے مقصدِ حیات کا شعور بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے اپنی شاعری میں "جستجو "کو ایک کلیدی پیغام بنایا ہے، جو انسان کو اپنے باطن کی تسخیر اور دوسروں کی خدمت پر اکساتا ہے۔

یہ جستجو ہی دراصل انسانیت سے بے لوث محبت اور ہمدردی کا دوسرا نام ہے۔ یہ ہمدردی ہی نسلِ انسانی کو باہم مربوط رکھنے والا وہ رشتہ ہے جو رواداری اور مساوات کو جنم دیتا ہے۔ یہ اخلاقیات کا وہ عظیم الشان ستون ہے جس کے بغیر معاشرت کا خیمہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اقبال کے نزدیک، دل میں محبت کا ایک چھوٹا سا شرارہ بھی حقیقت کے راز کھولنے کے لیے کافی ہے:

دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر
نور سے جس کی ملے رازِ حقیقت کی خبر
شاید قدرت کا آئینہ ہو ، دل میرا نہ ہو
سر میں جز ہمدردیِ انساں کوئی سودا نہ ہو (12)

یہی وہ جذبہ ہے جو معاشرتی طبقات اور نسلی تفاخر کو مٹا کر سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے، جہاں نہ کوئی آقا رہتا ہے اور نہ کوئی غلام:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز (13)

اخلاقیات کی یہ زنجیر محبت، شفقت، اور حسنِ ظن جیسی کڑیوں سے مکمل ہوتی ہے۔ جب انسان حرص و طمع کے بتوں کو پاش پاش کر کے محبت اور اخلاص کا پیکر بن جاتا ہے، تو وہ نہ صرف نفرتوں کو مٹانے اور محبتیں بانٹنے کے قابل ہو جاتا ہے، بلکہ وہ خالقِ حقیقی کی محبت کا بھی حقدار ٹھہرتا ہے، اور جس بندے سے اس کا رب محبت کرنے لگے، اس پر رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

انسانیت کو پارہ پارہ کرنے والے عوامل میں سب سے مہلک اور زہر آلود عنصر "ہوس" ہے، خواہ وہ مال و زر کی ہو یا جاہ و اقتدار کی۔ یہ وہ آتش ہے جو انسان کو دوسرے انسان سے جدا کرتی ہے اور اخلاقی اقدار کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ ہوس کا پجاری کبھی اخلاق کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتا، کیونکہ پاکیزگی اور غلاظت ایک ہی ظرف میں جمع نہیں ہو سکتے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی شاعری میں بارہا ان رذیل خصلتوں سے پرہیز اور پاکیزہ صفات کو اپنانے کا درس دیا ہے۔ ان کے نزدیک مردِ مومن کی شخصیت اتنی گہری اور ہمہ جہت ہوتی ہے کہ اس کی محبت اور نفرت، دونوں میں ایک خاص وقار اور مقصدیت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کا قہر بھی انتقام کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کے بندوں کی اصلاح اور شفقت کے جذبے سے لبریز ہوتا ہے:

اُس کی نفرت بھی عمیق ، اُس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اُس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق (14)

اقبال کے نزدیک، فطرت کا مقصود اور مسلمانی کا حقیقی راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ دنیا پر اخوت کا جھنڈا لہرائے اور محبت کا پیغام عام ہو جائے۔ انہوں نے ہوس کی پیدا کردہ تفریق پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے انسانیت کو دوبارہ متحد ہونے کا درس دیا:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اُخوت کا بیاں ہو جا ، محبت کی زباں ہو جا (15)

اقبال کے فلسفۂ اخلاق کا ایک اور تابناک ستون حیا، حمیت اور غیرت ہے۔ آج کی مادیت زدہ دنیا میں ان عظیم اقدار کو قدامت پرستی سمجھ کر حقارت سے دیکھا جاتا ہے، حالانکہ یہی وہ ستون ہیں جن پر کسی بھی تہذیب کا توازن اور استحکام قائم رہتا ہے۔ جس قوم یا ملت کا دامن شرم و حیا کی دولت سے مالا مال ہو، اس کا شیرازہ کبھی نہیں بکھرتا۔ اقبال کے نزدیک، غیرت وہ جوہر ہے جو ایک فقیر کو بھی بادشاہوں کا تاج پہنا سکتی ہے:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا (16)

وہ موجودہ دور کی بے حیائی اور اخلاقی گراوٹ پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نوجوان نسل کو اپنی جوانی کے دامن کو بے داغ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ (17)

اخلاقیات کے زینے کی ایک اور اہم سیڑھی "ادب" ہے۔ ایک باشعور اور مہذب معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ وہاں انسانی حرمت اور شرافت کو سب سے مقدم رکھا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں حسب و نسب، دولت اور مرتبے کی بنیاد پر تفریق نہیں کی جاتی، بلکہ انسان کی قدر اس کی انسانیت اور کردار کی وجہ سے ہوتی ہے۔ نسبی تفاخر محض شناسائی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے، برتری کی علامت نہیں۔

جب کسی معاشرے میں مساوات کا اصول رائج ہو جائے اور ہر فرد ادب و احترام کے تقاضوں کا پاسبان بن کر سماج کو زینت بخشنے میں کوشاں ہو، تو ایک ایسا حسین اور متوازن معاشرہ وجود میں آتا ہے جو ہر قسم کی اونچ نیچ اور طبقاتی تقسیم سے پاک ہوتا ہے۔ شاعرِ مشرق نے بھی اپنے کلام کے ذریعے اسی آفاقی درس کو عام کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے نزدیک، محبت کے آداب میں سب سے پہلا قرینہ خاموشی اور ادب کا لحاظ ہے:

خموش اے دل ! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں (18)

ایک صاحبِ اخلاق انسان کی سب سے روشن نشانی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور معاشرے کو نفرت، عداوت اور تعصب جیسے انسان دشمن جذبات کی آلودگی سے پاک کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتا ہے۔ یہ منفی جذبات انسان کو اس کے حقیقی مقام، یعنی شرفِ انسانیت سے گرا کر حیوانی جبلتوں کی پستی میں دھکیل دیتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں اخلاقی اقدار پنپ نہیں سکتیں۔ حقیقی انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے ہمنوع کے ساتھ دردمندی کا رشتہ استوار کرے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا ساتھی بنے اور مصیبت کی گھڑی میں دست و بازو ثابت ہو۔ یہی وہ جذبہ ہے جو معاشرے میں اخوت، ایثار اور بھائی چارے کے چشمے جاری کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر شبنم اسد:

"اقبال جس شاعرانہ اور والہانہ انداز سے اخلاقی اقدار کے گن گاتے ہیں وہ انہیں عالم انسانیت کا شاعر بنا دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے ایسے نظریات کی تلاش کی جس نے رنگ و نسل اور علاقائی امتیاز سے اوپر اٹھ کر اخوت، بھائی چارگی اور مساوات کی تعلیم دی۔"(19)

حکیم الامت علامہ اقبال کا کلام اسی آفاقی پیغام کی لازوال تفسیر ہے۔ ان کی شاعری آج بھی فکر کو تازگی اور عمل کو ولولہ عطا کرتی ہے۔ وہ محض کسی ایک قوم یا مذہب کے شاعر نہیں، بلکہ شاعرِ انسانیت ہیں، جن کا دل ہر انسانی ظلم پر تڑپ اٹھتا ہے۔ ان کا نظریہ آفاقی ہے، جو رنگ، نسل اور عقیدے کی تفریق مٹا کر سب کو ایک لڑی میں پرونے کا درس دیتا ہے۔ فکرِ اقبال کا مرکزی نقطہ انسان کی روحانی اور اخلاقی تکمیل ہے۔ انہوں نے اپنے پیغام میں محبت، انسانی حقوق، انصاف اور صلح رحمی کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام دبے اور پسے ہوئے طبقات کے لیے امید کا سہارا اور ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دلیل فراہم کرتا ہے۔ وہ محض انسان سے محبت کا درس نہیں دیتے، بلکہ کائنات کے ہر مظہر سے ایک زندہ اور تخلیقی رشتہ قائم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کی حقیقی محبت کا راستہ اس کی مخلوق سے محبت کے ذریعے ہی ملتا ہے:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو، خدا کے بندوں سے پیار ہو گا (20)

اقبال کے نزدیک محبت ہی وہ آبِ حیات ہے جو بیمار قوموں کو شفا بخشتی ہے اور ان کی سوئی ہوئی تقدیر کو جگاتی ہے۔ وہ تعصب کے اندھیروں میں بھٹکنے والے نادان کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کائنات کے آئینے میں نظر آنے والی ہر صورت، دراصل تیری ہی ذات کا ایک عکس ہے:

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے (21)
تعصب چھوڑ ناداں ! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری ، جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے (22)

جو قوم اپنے اسلاف کی فکری و تہذیبی میراث کو فراموش کر دیتی ہے، وہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتی ہے اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل میں ناکام رہتی ہے۔ اس کے برعکس، جو قوم اپنے ورثے کو ایک قیمتی اثاثہ سمجھ کر اس کی حفاظت کرتی ہے، وہی اخلاقی اور مادی ترقی کی منازل طے کرتی ہے۔ اقبال اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ معاشرے کی ترقی کا آغاز فرد کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ قوموں کی تقدیر افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا (23)

شاعرِ مشرق کا پیغام یہ ہے کہ انسان اپنے سوئے ہوئے ضمیر کو جگائے، اپنی زندگی کا محاسبہ کرے، اور ایک ایسے انقلاب کی بنیاد رکھے جو نہ صرف اس کی اپنی ذات بلکہ پوری انسانیت کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ وہ غلامی کی زندگی پر سر اٹھا کر جینے کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ جس زندگی میں انقلاب کی تڑپ نہ ہو، وہ موت سے بدتر ہے:

جس میں نہ ہو انقلاب ، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات ، کشمکشِ انقلاب (24)

اقبال انسان کو اس کے اس بلند مقام کی یاد دلاتے ہیں جو خالقِ کائنات نے اسے عطا کیا ہے۔ یہ مختصر سی دنیوی زندگی دراصل اس لیے ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے اصلی اور ابدی مقام کی طرف سفر کرے۔ اس کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، کیونکہ اس کی منزل ہر مقام سے آگے ہے:

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں (25)

یہ انسان کا "عمل" ہی ہے جو اس کے لیے جنت یا جہنم کا سامان کرتا ہے۔ اس کی فطرت میں نوری اور ناری، دونوں امکانات پوشیدہ ہیں اور انتخاب کا اختیار اسے سونپا گیا ہے۔ جتنا گہرا حکیم الامت کے کلام کا مطالعہ کیا جائے، اتنی ہی انسان کے اندر کی کوتاہ نظری اور پست ہمتی دور ہوتی ہے۔ ان کا کلام اخلاقی اقدار کے احیاء اور انسانیت کی بقا کا ایک لازوال پیغام ہے۔ ان کے انقلابی افکار نے دنیا بھر کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا اور آج بھی ان کا پیغام امن، محبت، مساوات، اور رواداری جیسے موضوعات کے ذریعے ایک صحت مند اور باشعور معاشرے کی تعمیر کے لیے ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ محمد اقبال کے اردو کلام میں "تصورِ اخلاق" محض چند روایتی نصیحتوں یا فلسفیانہ نکات کا مجموعہ نہیں، بلکہ یہ ایک متحرک، انقلابی اور ہمہ گیر نظامِ فکر ہے جس کا مقصد ایک ایسی شخصیت اور

معاشرے کی تشکیل ہے جو روحانی اور مادی، دونوں اعتبار سے اپنی معراج کو پہنچ سکے۔ اقبال کے نزدیک اخلاق، جامد اصولوں کا نام نہیں بلکہ یہ "فلسفۂ خودی "کا عملی ظہور اور زندگی کی مسلسل کشمکش کا لازمی جزو ہے۔

حاصلِ بحث:

کلامِ اقبال (اُردو) میں "تصورِ اخلاق" ایک جامع اور انقلابی ضابطۂ حیات ہے۔ یہ محض ذاتی نجات یا انفرادی پارسائی کا درس نہیں دیتا، بلکہ ایک ایسے فعال، خود شناس، اور بامقصد انسان کی تشکیل پر زور دیتا ہے جو اپنی ذات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کوشاں ہو۔ اقبال کا اخلاقی نظام انسان کو پستی سے اٹھا کر بلندی، جمود سے نکال کر حرکت، اور محدودیت سے نکال کر آفاقیت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ کردار کی تعمیر کا وہ نسخہ ہے جس کا مقصد ایک ایسا "انسانِ کامل" پیدا کرنا ہے جو زمین پر خدا کا نائب ہونے کا صحیح معنوں میں حق ادا کر سکے۔

All Rights Reserved © 2025 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

حوالہ جات وحواشی

(1) نصرت رشید، اقبال اور اخلاقیات کا مختصر جائزہ، مشمولہ: ماہانہ ”سبقِ اردو“، دہلی: گوپی گنج بدوہی، یوپی انڈیا، شمارہ اکتوبر2022ء، ص32

Nusrat Rasheed, Iqbal aur Ikhlaqiat ka mukhtasir Jaiza, Masmola: Monthly Sabaq e Urdu, Dehli, Gopi Ganj Badohi, UP, India, Oct, Nov, 2022, P.32

(2) علامہ محمد اقبال، ”کلیات اقبال“ (اُردو)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص58/558

Allama Muhammad Iqbal, Kulyaat e Iqbal (Urdu), Lahore: Iqbal Ikadmi, Pakistan, 1990, P. 58/558

(3) ایضاً، ص137/461

Ibid, P. 461/137

(4) ایضاً، ص178/678

Ibid, P. 678/178

(5) ایضاً، ص100/424

Ibid, P. 424/100

(6) ایضاً، ص27/351

Ibid, P. 351/27

(7) ایضاً، ص20/344

Ibid, P. 344/20

(8) ایضاً، ص151/167

Ibid, P. 167/151

(9) صنم شاکر، ڈاکٹر، انسانی اخلاقی اقدار اور فکرِ اقبال، مشمولہ: اردو سکالرز کی دنیا، حیدر آباد، (آنلائن جرنل) شمارہ8، فروری2020ء، ص54

Sanam Shakir, Dr. , Insani Akhlaqi Aqdar aur Fikr e Iqbal, Masmola: Urdu Scholars ki Dunya, Haiderabad, Issue 8, Feb. 2020, P. 54

(10) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو، ص84/100

Allama Muhammad Iqbal, Kulyaat e Iqbal (Urdu), P. 100/84

(11) ایضاً، ص55/379

Ibid, P. 379/55

(12) ایضاً، ص65/81

Ibid, P. 81/65

(13) ایضاً، ص177/193

Ibid, P. 193/177

(14) ایضاً، ص141/641

Ibid, P. 441/141

(15) ایضاً، ص288/304

Ibid, P. 304/288

(16) ایضاً، ص21/713

Ibid, P. 713/21

(17) ایضاً، ص119/443

Ibid, P. 443/119

(18) ایضاً، ص114/130

Ibid, P. 130/114

(19) شبنم اسد، ڈاکٹر، اقبال کے کلام میں اخلاقیات، مشمولہ: سہ ماہی "جہانِ اردو" در بھنگہ، شمارہ72، 71، جولائی تا دسمبر2018ء، ص250

,Shabnam Asad, DoctorIqbalke Kalam mein Akhlaqiyat, mashmoola: Sah-maahi "Jahan-e-Urdu", Darbhanga, Issue 71, 72, July-December 2018, P. 250

(20) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو، ص152/ 168

Allama MuhammadIqbalKulyaat e Iqbal (Urdu), P. 152/168 ,

(21) ایضاً، ص87/ 103

Ibid, P. 103/87

(22) ایضاً، ص85/ 101

Ibid, P. 101/85

(23) ایضاً، ص191/ 207

Ibid, P. 207/191

(24) ایضاً، ص104/ 428

Ibid, P. 428/104

(25) ایضاً، ص54/ 375

Ibid, P. 375/54